ساتواں در

امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد کی تصنیفات

شاعری

۱۔ برزخ

۲۔ ساتواں در

۳۔ فشار

۴۔ ذرا پھر سے کہنا

۵۔ آنکھوں میں ترے سپنے (گیت)

تراجم

۶۔ عکس (فلسطینی شاعری)

۷۔ کالے لوگوں کی روشن نظمیں (نیگرو شاعری)

سفرنامہ

۸۔ شہر در شہر

تنقید

۹۔ نئے پرانے (زیرِ طبع)

کالم

۱۰۔ چشمِ تماشا (زیرِ طبع)
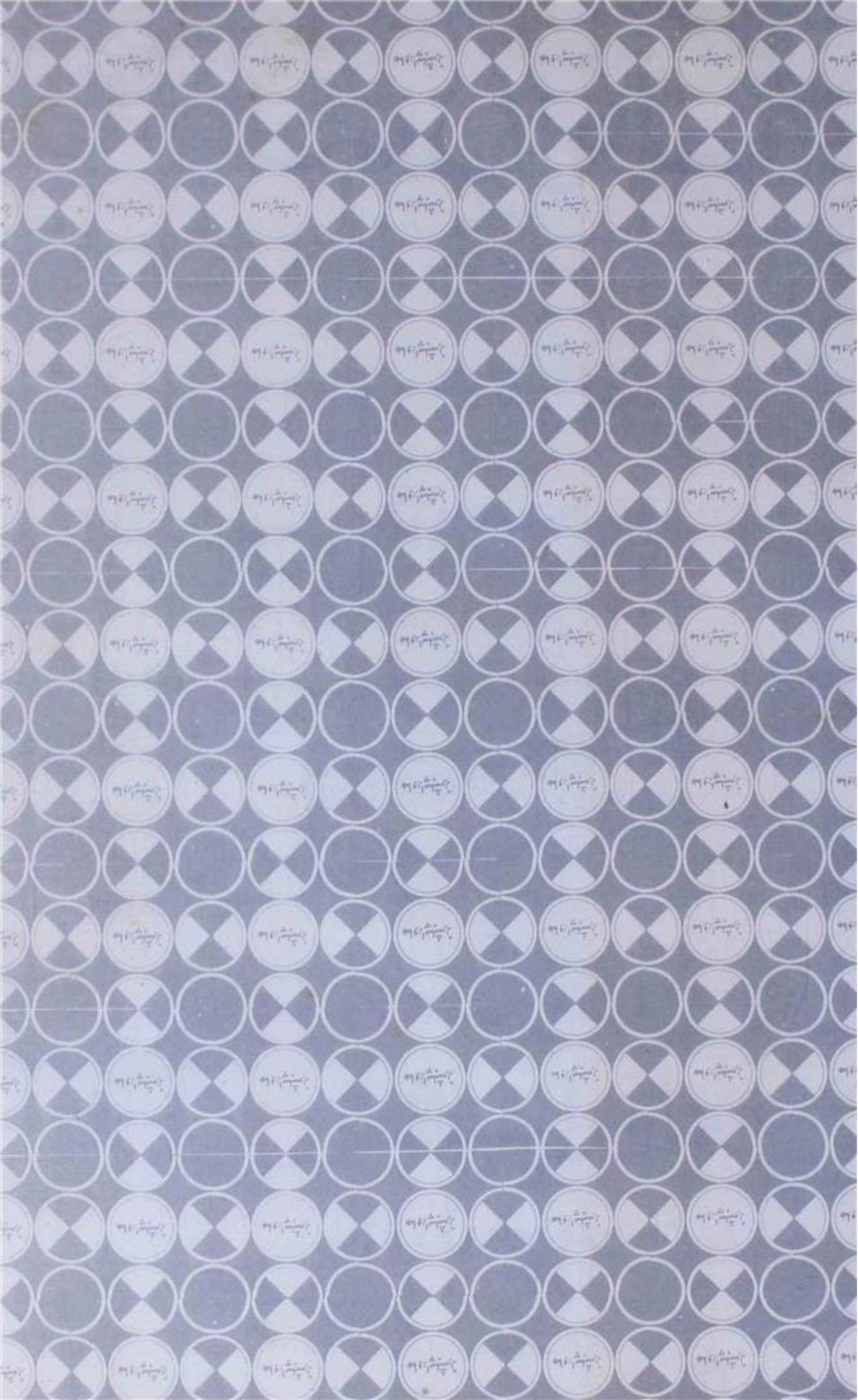
ساتواں در

امجد اسلام امجد

ماورا پبلشرز
۳- بہاولپور روڈ، لاہور

احمد ندیم قاسمی ـــــ کے نام

جو ہمارے عہد کا زندہ ضمیر ہیں

بار چہارم : فروری ۱۹۸۹ء
تعداد : ایک ہزار
ناشر : خالد شریف
کتابت : محمد حسین شاہ
مطبع : مکتبہ جدید پریس ۔ لاہور
قیمت : ۵۰ روپے
سرورق : اسلم کمال

فہرست

پیش کلام

"گمشدہ آوازیں" میری ذاتی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے۔ "ذاتی" میں نے اس لیے کہا کہ اس دوران میں میری ایک اور کتاب "عکس" شائع ہو چکی ہے لیکن وہ جدید فلسطینی شاعری کے منظوم تراجم پر مشتمل ہے اس لیے میں اُسے مکمل طور پر اپنے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا۔ اس کتاب میں "برزخ" کے بعد کہی ہوئی نظمیں اور میری جملہ غزلوں کا انتخاب شامل ہے۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور مجھے جو کچھ کہنا تھا، بزبانِ شعر کہہ دیا ہے۔ البتہ چند باتیں شاعری اور معاشرے میں اُس کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں ضرور کرنا چاہوں گا۔

"برزخ" کے ابتدائیے میں بھی میں نے عرض کیا تھا کہ شاعری میرے نزدیک ماضی اور حال کے حوالے سے مستقبل میں موجود امکانات کی نشاندہی کا عمل ہے کہ میں تینوں زمانوں کو ایک اکائی میں دیکھنے کا قائل ہوں، لیکن ضروری نہیں کہ ایک مخصوص فرد کے لیے تینوں زمانے فکری سطح پر بھی اُسی طرح صورت پذیر ہوں جیسے کوئی دوسرا فرد یا گروہ اُنھیں دیکھتا ہے۔ زندگی کے تسلسل اور ارتقا کو سمجھنے کے لیے ہر آدمی اس بے انت سمندر سے کچھ لہریں، کچھ سیپیاں اور کچھ ساحل چنتا ہے۔ شاعری میں چونکہ شاعر کی ذات مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کسی شاعر کی جذباتی زندگی اور اندازِ فکر کا اثر اُس کے فن پر پڑنا ناگزیر ہے اور درحقیقت یہی وہ سطح ہے۔ جہاں ایک ہی عہد کے شاعر، ایک دوسرے سے الگ اپنی انفرادیت کی شناخت اور پہچان کراتے ہیں۔

شاعروں کے ساتھ سب سے بڑا گھپلا جو ہمارے نقادوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُن پر طرح طرح کے لیبل اور ٹھپے لگا دیے ہیں (روحانی، انقلابی، رجعت پسندانہ، اخلاقی، نفسیاتی، فلسفیانہ وغیرہ وغیرہ) میرے خیال میں شاعر صرف دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اچھے شاعر اور بُرے شاعر۔ اور یہی تفریق شاعری میں بھی کی جاسکتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ کسی شاعر کو بنیادی سطح پر محض اُس کی شاعری کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا جائے اور اس کے بعد اُس کے موضوعات، اسلوب اور رجحانات کی بنا پر محاکمے صادر کیے جائیں۔ شاعر کبوتر نہیں ہوتے کہ آپ ڈربوں پر "جنگلی" "لقے" اور "شیرازی" وغیرہ لکھ کر اُنھیں بند کرتے جائیں۔

اچھی شاعری کے لیے پہلی شرط سوشلسٹ، مسلمان، دہریہ، رائٹسٹ یا لیفٹسٹ ہونا نہیں بلکہ اچھا شاعر ہونا ہے۔ البتہ جو شاعر حقیقت، انسانیت، انصاف پسندی اور ارتقا پر یقین رکھتا ہے اور ان سے اپنے فن کا رشتہ استوار رکھتا ہے اُسے ایک بونس کا پوائنٹ بھی مل جاتا ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ بونس پوائنٹ صرف اُسی صورت میں کام آتا ہے جب شاعر بنیادی طور پر اچھا اور عمدہ ہو۔ فیض اور ندیم کے مقابلے میں بہت سے ترقی پسندوں کے یہاں انقلاب کا غلغلہ بہت زیادہ ہے لیکن اُنھیں ادب میں وہ مقام نہیں ملا جس پر آج فیض اور ندیم فائز ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں بنیادی طور پر اعلیٰ شاعر ہیں اور ان کی ترقی پسندی اس بنیادی خصوصیت سے مل کر دو آتشہ ہو گئی ہے

معاصر پاکستانی شاعری میں بے پناہ تخلیقی قوت ہے لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے بیشتر نقّاد شاعروں کو اُن کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے کے بجائے تنقیدی دبستانوں کے حوالے سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں اور یوں اس تخلیقی قوت کو نقّاد کی طرف سے وہ رہنمائی اور حوصلہ افزائی نہیں مل رہی جو کسی معاشرے کی تہذیبی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ اگرچہ میں خود اس خیال سے بہت حد تک متفق ہوں کہ شاعری پر سب سے بہتر تنقید شاعر اور وہ بھی صرف اچھے شاعر ہی کر سکتے ہیں لیکن اچھی جامع اور بھرپور تنقید کے لیے نقاد کے مطالعے کا وسیع اور غیر جانبدار ہونا بھی لازمی ہوتا ہے اور یہ وہ شرط ہے جس پر شاید بہت سے اچھے شاعر بھی پورا نہیں اُترتے۔ تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ ہمارے معاشرے کی معروضی تعلیمی اور تہذیبی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اچھی شاعری کو عمدہ تنقید سے آراستہ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے کیونکہ خوبصورت عملوں کے لیے خوبصورت خیالوں کا موجود ہونا بہت اہم اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ اچھی شاعری کا مطالعہ شخصیت کی تعمیر میں انتہائی مثبت رول ادا کرتا ہے اور اس کی مہک افراد سے ہوتی ہُوئی پُورے معاشرے کو معطّر کر دیتی ہے۔

یہ کتاب میری سوچ اور خوابوں کا آئنہ ہے۔ اگر اس کے قارئین اس میں اپنی ذات کو بھی رُونما پائیں تو مجھے خوشی ہو گی۔

۱۰-جنوری ۱۹۷۸ء
۶۵-فلیمنگ روڈ لاہور

امجد اسلام امجد

ساتواں در (چوتھا ایڈیشن)

ساتواں در' پہلی بار ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی، گزشتہ دس برس میں یہ اس کا چوتھا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ کتابی دنیا کی موجودہ صورتِ حال کو سامنے رکھا جائے تو یہ کتاب اپنے دور کے مقبول ترین شعری مجموعوں میں شمار ہو گی۔ لیکن کیا دس کروڑ کی آبادی والے اس وطنِ عزیز میں شاعری کی۔ اور وہ بھی مقبول شاعری کی یہ "پذیرائی" ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور نہیں کرتی!

میرے ناشر خالد شریف نے اس ایڈیشن میں تزئین و آرائش کے حوالے کچھ خصوصی کاوشیں کی ہیں، امید ہے آپ کو پسند آئیں گی کہ حسنِ سیرت اور حسنِ صورت جب یک جان ہو جائیں تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ حالی نے کیا اچھی بات کہی ہے؛

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

امجد اسلام امجد
۲۴ر اکتوبر ۸۸ء

۲۲- ممتاز سٹریٹ
گڑھی شاہو، لاہور

پہلا لفظ تھا اسم خدا کا دوسرا لفظ جُدائی
بعد کی گنجلک دار عبارت کچھ نہ سمجھ میں آئی

حمد

تلاش میں ہیں تری بحر و بر، کہاں ہے تُو
جمالِ دیدۂ شمس و قمر، کہاں ہے تُو

لگی ہوئی ہیں قطاریں سی رہگزاروں کی
مرے ندیم، مرے راہبر، کہاں ہے تُو

ہواؤں میں، مہ و خورشید میں سُنا تجھ کو
کبھی تو قریۂ جاں میں اُتر، کہاں ہے تُو

تُو رشکِ خواب سہی، آنسوؤں کی آب سہی
پلٹ بھی جاتی ہے تھک کر نظر، کہاں ہے تُو

اب ایسا شوق بھی کیا بے نشان رہنے کا
صدف کے ساتھ ہے آب گہر، کہاں ہے تُو

بجا کہ عالمِ موجود ہے تیری تخلیق
اس آئینے میں مرے نقش گر، کہاں ہے تُو

نعت

میرے احساس کے دریا میں روانی تجھ سے
اے گلِ جاں، مرے ہونے کی نشانی تجھ سے

موسمِ گُل بھی ترا، فصلِ خزاں بھی تیری
میری آواز کے صحراؤں میں پانی تجھ سے

تجھ سے ہی میری تمنّاؤں نے وسعت پائی!
آنکھ کے رنگ، سماعت کے معانی تجھ سے

تجھ سے آنکھوں نے لیا رنگ پرکھنے کا ہُنر
لفظ کی جادوگری نطق نے جانی تجھ سے

تُو جو چاہے تو سمندر کو کنارا کر دے
خاک کے بخت میں پیدا ہو گرانی تجھ سے

نئے لفظوں کی خوشبو

لکھوں وہ لفظ، کسی نے لکھے نہ ہوں اب تک
کروں وہ بات نہ جس سے ہو آشنا کوئی
چُنوں وہ رنگ جو پیدا نہیں ہُوئے، لیکن
یہ آگہی کے عَلَم کس لیے بلند کروں!

جو میرے ذہن میں جلتا ہے اُس چراغ کی لَو
وہ روشنی تو نہیں جس کی آرزو لے کر
ازل سے محوِ سفر ہیں یہ آدمی زادے
سیاہ بخت لیے — رزقِ پائے بادبنے

دیارِ ذہن میں جلتے ہوئے چراغ، ٹھہر
تری ضیاء، تو کوئی اور راہ پا لے گی
یہ موجِ سیل ہے، رستہ نیا بنا لے گی
مگر یہ قبر سے تاریک بستیاں میری
یہاں چراغ نہیں، سورجوں کی حاجت ہے
ہمارے خوں سے مہکتے ہوئے جواں سورج
زمانے بھر کے غریبوں کے ترجماں سورج
جہاں جہاں ہے اندھیرا، وہاں وہاں سورج

میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہوں
اور ایسے رنگ چُنوں گا جو میری گل میں ہیں

غزل

وہ بادِ شام تھا اُس کو گزر ہی جانا تھا
گُلِ اُمید کھِلا تھا، بکھر ہی جانا تھا

زمیں کا رزق ہوئے وصل و انتظار کے رنگ
پسِ بہار یہ نشّہ اُتر ہی جانا تھا

ہر اک سفر کی حدوں پر تھا ایک اور سفر
تمھارا ساتھ نہ ملتا تو مر ہی جانا تھا

وہ ایسے ناز سے گزرا کہ میں بُلا نہ سکا
یہ اور بات مجھے بھی اُدھر ہی جانا تھا

سفر کی اوّلیں شب میں گریز کر جاتا
اُسے یہ ہاتھ اگر چھوڑ کر ہی جانا تھا

وفا کے باب میں لفظوں کے سلسلے تھے بہت
کہیں کسی کو مری جاں ، ٹھہر کے ہی جانا تھا

اُفق کے ہاتھ پہ تاروں کا خون تھا امجدؔ
مَیں کور چشم اسے بھی سحر ہی جانا تھا

۱۹۷۷ء

رات کی سانسیں ٹوٹ رہی ہیں

بھٹک رہے ہیں رنگ بدن میں
تتلی بن کر ہاتھ
دل کی شاخ پہ چمک رہی ہے
شبنم سی اک بات

بکھر رہی ہے لمحہ لمحہ
بجھتے چاند کی پہنائی میں
وصل کی پہلی رات!

۱۹۷۷ء

غزل

(نذرِ اقبال)

ہجومِ صید میں دیکھا گھِرا ہُوا صیّاد
بدل رہا ہے نیا روپ عالمِ ایجاد

تمھاری میری محبّت بحال کیسے ہو!
تغیّرات پہ قائم ہے وقت کی بنیاد

جب اپنی آنکھ کا دیکھا نہ معتبر ٹھہرے
کہاں سے لائیں خیالوں کے واسطے اسناد

وہ کیا گھڑی تھی، کہاں پہ ملے تھے ہم دونوں
وہ چل دیا تو مجھے دیر تک نہ آیا یاد

سانواں در

۲۱

مرا بدن تھا گھنے جنگلوں کی تاریکی
تری طلب نے کیا ہے یہ خاکداں آباد

میں اپنے ہست کی تنہائیوں میں رہتا ہوں
یہ مسکراتا ہُوا شخص ہے مرا ہمزاد

جو بستیاں تھیں انھیں تو مٹا چکے امجدؔ
نجانے اب یہ خرابے کرے گا کون آباد

۱۹۷۷ء

فرض کرو

فرض کرو ہم تارے ہوتے
اِک دُوجے کو دُور دُور سے دیکھ دیکھ کر جلتے بجھتے
اور پھر اک دن
شاخِ فلک سے گرتے اور تاریک خلاؤں میں کھو جاتے!

دریا کے دو دھارے ہوتے
اپنی اپنی موج میں بہتے
اور سمندر تک اس اندھی، وحشی اور منہ زور مسافت
کے جادو میں تنہا رہتے!

فرض کرو ہم بھور سمے کے پنچھی ہوتے،
اُڑتے اُڑتے اِک دوجے کو چھُوتے — اور پھر
کھلے گگن کی گہری اور بے صرفہ آنکھوں میں کھو جاتے!

ابرِ بہار کے جھونکے ہوتے،
موسم کے اک بے نقشہ سے خواب میں مِلتے
مِلتے اور جُدا ہو جاتے
خشک زمینوں کے ہاتھوں پر سبز لکیریں کندہ کرتے
اور اَن دیکھے سپنے بوتے
اپنے اپنے آنسو رو کر چین سے سوتے،
فرض کرو ہم جو کچھ اب ہیں وہ ناں ہوتے —؟

۱۹۷۷ء

غزل

کہنے کو میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں
امجدؔ مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں

ڈرتا ہوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
میں جاگ تو رہا ہوں مگر جاگتا نہیں

آشفتگی سے اُس کی اُسے بے وفا نہ جان
عادت کی بات اور ہے دل کا بُرا نہیں

صاحبِ نظر سے کرنا ہے پتھر بھی گفتگو
ناجنس کے حضور زباں کھولتا نہیں

تنہا اُداس چاند کو سمجھو نہ بے خبر
ہر بات سُن رہا ہے مگر بولتا نہیں

خاموش رتجگوں کا دھواں تھا چہار سُو
نکلا کب آفتاب مجھے تو پتا نہیں!

امجد وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر
اُن میں کوئی بھی عکس مرے نام کا نہیں

۱۹۷۷ء

رات

جاگتی آنکھ کا ہر بھید پتہ ہے اُس کو
یہ الگ بات کہ کچھ منہ سے نہیں بولتی رات

شہرِ دربند سے ٹکرا کے فنا ہو جاتے
ہم پہ یہ ریشمی باہیں نہ اگر کھولتی رات

۱۹۷۷ء

چور دروازہ

بھیگتی شب ہے فلک پر ہیں ستارے ہر سُو

شاید اس وقت مرے ساتھ ہزاروں آنکھیں

اِن کا ضو بار سفر دیکھتی ہوں!

سوچتی ہوں!

"کون تارا ہے کہاں!

چاند سے کتنا قریب!

کہکشاں زاد کہ تنہا تنہا"

پھر اچانک جو کوئی
ابر کا سایہ ساتاروں کی گزرگاہ میں لہراتا ہے
دل بولتا ہے
دل بہت دھیرے سے کانوں میں مرے بولتا ہے
"یہ تو سب ایک سے تارے ہیں تمھیں
یہ بھی معلوم نہیں
جو ابھی ٹوٹ کے بکھرا ہے، کہاں تھا، کیا تھا!"

کس کو معلوم ستارے بھی ہمیں دیکھتے ہوں!

۱۹۷۷ء

غزل

نعرہ نہیں تو نالہ ہی کوئی بلند ہو
اے ساکنانِ شہرِ ستمگار کچھ کہو

کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تارِ بے حسی
کرتے ہو بند کس طرح سورج کی آنکھ کو!

سہمے ہوئے ہیں اپنی ہی خاموشیوں سے لوگ
مُردہ نہیں یہ شہر مگر تم صدا تو دو

کیوں ہاتھ باندھے بیٹھے رہو مجرموں کی مثل
دستِ ستم شعار سے تلوار چھین لو

امجد یہ رتجگے ہیں سزا خوابِ مست کی
تاروں کے سائبان تلے جاگتے رہو

۱۹۷۷ء

چُن لو اپنے اپنے خواب

چُن لو اپنے اپنے خواب

اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا
مہتابوں اور گلابوں کا
ہر آنکھ طلب سے بوجھل ہے
ہر خواب کسی کی منزل ہے
ہر خواب تمنّاؤں کا باب
چُن لو اپنے اپنے خواب

یہ شام سمے کا دھندا ہے

اس وقت یہاں پر مندا ہے

ایمان کی قیمت دو آنے

احسان کی قیمت دو آنے

توقیر ملے گی دو آنے

تشہیر ملے گی دو آنے

ہر خوب کی قیمت دو آنے

ہر خواب کی قیمت دو آنے

دو آنے بھئی دو آنے

دو آنے بھئی دو آنے

۱۹۷۷ء

۳۲

ایک سوال

قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال!

کب ٹوٹے گا سر سے ہمارے لوہے کا یہ جال

لوہے کا یہ جال کہ جس میں

تیس برس سے قید ہیں اپنے سارے خواب خیال

بنجر ماہ و سال

بنجر ماہ و سال کہ جن کے

چہرے ہرے کچور ہیں لیکن آنکھیں لالو لال

آنکھیں لالو لال کہ جن میں

ہولے ہولے تیر رہے ہیں پھیکے زرد ہلال

قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال

کب تک اس مٹی کے بیٹھے ہوں گے یوں بے حال

کب تک ہم کو بننا ہوگا — نیلامی کا مال۔

۱۹۷۷ء

شطرنج

وہ بادشاہ ہو، گھوڑا ہو، فیل ہو کہ وزیر
بساطِ دہر پہ بکھرے ہُوئے سبھی مُہرے
جو کوئی غور سے دیکھے تو صرف پیادے ہیں
شکست و فتح کے جھگڑوں سے بے خبر، چپ چاپ
صلیبِ وقت پہ لٹکے ہُوئے ارادے ہیں

۱۹۷۷ء

غزل

کسی کی آنکھ جو پُر نم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو غم نہیں ہے

سوادِ درد میں تنہا کھڑا ہوں!
پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی!
اگرچہ گفتگو مبہم نہیں ہے

سلگتا کیوں نہیں تاریک جنگل
طلب کی لو اگر مدّھم نہیں ہے

یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

۳۵

کنارا دوسرا دریا کا جیسے
وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا
وجودِ تیرگی محکم نہیں ہے

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

جو کوئی سُن سکے امجدؔ تو دنیا
بجز اک بازگشتِ غم نہیں ہے

۱۹۷۷ء

کبھی کبھی...

کبھی کبھی ان حبس بھری راتوں میں

جب

سب آوازیں سو جاتی ہیں

آدھی نیند کی گھائل سی مدہوشی میں

اِک خواب انوکھا جاگتا ہے!

میں دیکھتا ہوں

گرد کی اس چادر سے اُدھر

(جو میرے اُس کے بیچ تنی ہے)

وہ بھی تنہا جاگ رہا ہے۔

۱۹۷۷ء

میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی

چینی کی گڑیا سی جب وہ
چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی
میری جانب آتی ہے، تو
اُس کے لبوں پہ ایک ستارا کِھلتا ہے
"پاپا"
اللہ — اس آواز میں کتنی راحت ہے
ننّھے ننّھے ہاتھ بڑھا کر
جب وہ مجھ کو چھُوتی ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے میری روح کی ساری سچّائی
اُس کے لمس میں جاگ اُٹھی ہے۔

اے مالک، اے ارض و سما کو چٹکی میں بھر لینے والے
تیرے سب معمور خزانے
میری ایک طلب!
میرا سب کچھ مجھ سے لے لے
لیکن جب تک
اس آکاش پہ تارے جلتے بجھتے ہیں
میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی،
اے دنیا کے ربّ!
کوئی نہیں ہے اس لمحے میں تیرے میرے پاس
سچ سچ مجھ سے کہہ
تیرے ان معمور خزانوں کی بے انت گرہ میں
بچّے کی معصوم ہنسی سے زیادہ پیاری شئے
کیا کوئی ہے؟

۱۹۷۷ء

غزل

تلاشِ منزلِ جاناں تو اِک بہانہ تھا
تمام عمر میں اپنی طرف روانہ تھا

میں تیری دُھن میں رواں تھا مجھے پتہ نہ چلا
غبارِ راہ میں شامل غمِ زمانہ تھا

مَیں اُس کو حشر میں کس نام سے صدا دیتا
کہ میرا اُس کا تعارف تو غائبانہ تھا

عجب کشش تھی سمندر کی سبز آنکھوں میں
ہر ایک چشمہ اُسی کی طرف روانہ تھا

وہی نہیں تو ورق کس لیے سیاہ کریں
سخن تو عرضِ تمنّا کا اِک بہانہ تھا

سمندِ شوق تھا امجدؔ رواں دواں جب تک
قدم کے نیچے ستاروں کا شامیانہ تھا

۱۹۷۷ء

نئے سال کی پہلی نظم

چلو کچھ آج حسابِ زیانِ جاں کر لیں!
الم شمار کریں — درد آشکار کریں
گلے جو دل کی تہوں میں ہیں آبلوں کی طرح
انھیں بھی آج شناسائے نوکِ خار کریں

جو بے وفا ہو اُسے بے وفا کہیں کھُل کر
حدیثِ چشم و لبِ سوختہ کہیں کھُل کر
کہاں تلک یہ تکلّم زمانہ سازی کے
پسِ کلام ہے جو کچھ ذرا کہیں کھُل کر

خنک خنک سی ہنسی ہنس کے مل رہے ہو کیوں!
لہو ہے سرد تو آنکھیں بھی منجمد کر لو
جو دل میں دفن ہے، پتھروں پہ اشتہار کریں
الم شمار کریں — درد آشکار کریں

تمہارا میرا تعلّق بس ایک لفظ کا ہے
لُغت کے انت میں سمٹا ہُوا فقط اک لفظ
اس ایک لفظ میں سچّائی ہے زمانوں کی
چلو کہ آج یہی لفظ اختیار کریں
تمام عمر پڑی ہے منافقت کے لیے
اس ایک لفظ کا دامن نہ داغدار کریں
الم شمار کریں — درد آشکار کریں
چلو کچھ آج حسابِ زیانِ جاں کر لیں!

۱۹۷۶ء

غزل

بستیوں میں اک صدائے بے صدا رہ جائے گی
بام و در پر نقش تحریرِ ہوا رہ جائے گی

آنسوؤں کا رزق ہوں گی بے نتیجہ چاہتیں
خشک ہونٹوں پر لرزتی اک دعا رہ جائے گی

رُو برو منظر نہ ہوں تو آئنے کس کام کے
ہم نہیں ہوں گے تو دنیا گردِ پا رہ جائے گی

خواب کے نشّے میں جھکتی جائے گی چشمِ قمر
رات کی آنکھوں میں پھیلی التجا رہ جائے گی

بے ثمر پیڑوں کو چومیں گے صبا کے سبز لب
دیکھ لینا، یہ خزاں بے دست و پا رہ جائے گی

۱۹۷۶ء

زمستاں مرے جسم میں موجزن ہے

کوئی بات کہہ کے،
میں جب اپنی سانسوں کو کہرے میں لپٹی ہوئی
شاہراہوں پہ چلتے ہوئے دیکھتا ہوں،
تو بے روئے آنسو کا جالا سا چاروں طرف پھیلتا ہے
اور آگے کی چیزیں ہیولوں کی مانند بنتی بگڑتی ہیں
تب لوگ کہتے ہیں
"یہ رُت زمستاں کے کھِلنے کی ہے"
اور میں سوچتا ہوں
"زمستاں کہاں ہے
دھواں بنتی سانسوں میں!

آنسو کے جالے ہیں!

یا ان ہیولوں کے بننے بگڑنے ہیں یا.....''

اگر یہ حقیقت ہیں فصلِ زمستاں ہے تو کس سے پوچھوں

کہ جو اتنے موسم گئے اور آئے

سبھی کی شباہت زمستاں سی کیوں تھی؟

(۲)

کئی سال گزرے

انھی شاہراہوں پہ چلتے ہوئے، ہم کوئی بات کہہ کے

دھواں بنتی سانسوں میں اپنے ہی الفاظ کو دیکھتے تھے،

نجانے میں اُس وقت کیا کہہ رہا تھا؟

کہ تم تھے جو کچھ کہتے کہتے اچانک رُکے تھے؟

کہ پھر یہ زمستاں تھا جس نے کوئی اَن کہی بات کاٹی تھی؟

کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں — !

صرف اتنا پتہ ہے

کہ اس دن سے آنکھوں میں آنسو کے جالے ہیں

آگے کی چیزیں ہیولوں کی مانند بنتی بگڑتی ہیں . . . . .

بنتی بگڑتی ہیں . . . . . بنتی بگڑتی چلی جا رہی ہیں

(۳)

زمستاں جدائی کے موسم کا اک آئنہ ہے

اور اس آئنے میں

تمھیں جس گھڑی میں مسافت کی پھیلی ہُوئی دُھند میں دیکھتا ہوں

مجھے ایسے لگتا ہے

جیسے ہر اک شے اسی ایک لمحے سے پیدا ہُوئی ہے ،

ہر ایک رُت اسی خواب کا عکس ہے، سارے موسم مرے

جسم میں موجزن ہیں

لہو کے سمندر کی امواج ہیں — !

زمیں ، آسماں ، پھول ، تارے ، ہوائیں ، سمندر ، جزیرے

پہاڑ اور ندیاں

تمھارے ہی چہرے کے بھُولے ہُوئے نقش ہیں اور موسم،
ازل سے ابد تک کا ہر ایک موسم،
جدائی کے موسم کی تجرید ہے۔

(۴)

زمستاں مرے ہست کا استعارہ ہے، وہ آئنہ ہے
جو کھوئے ہُوئے عکس کا ترجماں ہے
جدائی کے لمحے سے کچھ دیر پہلے جو تم مسکرائے تھے
اس کا گماں ہے

کوئی بات کہہ کے
میں جب اپنی سانسوں کو کہرے میں لپٹی ہُوئی شاہراہوں
پہ چلتے ہُوئے دیکھتا ہوں تو بے روئے آنسو کا جالا سا چاروں
طرف پھیلتا ہے اور آگے کی چیزیں ہیولوں کی مانند بنتی بگڑتی ہیں
میں سوچتا ہوں — زمستاں کہاں ہے!

۱۹۷۶ء

فرزندِ چین کے نام، ایک نظم

موت وہ محور ہے جس پر
اس زمیں کا سرد گولا گھومتا ہے
اس جہانِ آب و گل کا زرد گولہ
جس میں اُونچے اُونچے پربت، سبز پیکر وادیاں
بے جہت صحرا، سمندر، ساحلوں کی بستیاں
خاک کے پردے میں پسپنی بے ٹھکانہ ہڈیاں
جاگتے، سوئے ہوئے آتش فشاں
وقت کے اک بے نشاں دھارے میں ہیں
کارواں در کارواں!
پیہم رواں!

اس غبارِ رائیگاں میں آدمی کی زندگی
خاک کے ذرّے کی اک تمثال ہے
خاک کا ذرّہ — جو کم قیمت ہے
بے مایہ ہے، جنسِ رائیگاں ہے
اپنے ہونے اور نہ ہونے کا گماں ہے!

اَن گنت کیڑوں مکوڑوں کی طرح
ہر گھڑی، ہر پل فنا ہوتی ہوئی مخلوق کے انبوہ میں
جب میں اس دشتِ فنا کو دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
ابنِ آدم خاک کا اک ذرّۂ کم تر سہی
پر اسی سے اس جہانِ آب و گل کی زندگی ہے
اِک کرن ہے
جو ازل کی صبح سے گرمِ سفر ہے

پر ابد تک اس کی لَو سے روشنی ہی روشنی ہے

جب کوئی آدم کا بیٹا

چین کے اس بطلِ حرّیت سا بیٹا

اس جہانِ آب و گِل سے روشنی کی لہر بن کر پھُوٹتا ہے

ٹوٹتا ہے!

خالقِ کون و مکاں،

آسماں کے تخت سے نیچے اُتر کر

اپنے آدم کی جبیں کو چُومتا ہے۔

۱۹۷۶ء

محمدؐ علی جناح کے لیے ایک نظم

آدم کی تاریخ کے سینے میں ڈوبے ہیں
کتنے سورج، کتنے چاند!
کیسے کیسے رنگ تھے جو مٹی سے پھوٹے
موجِ ہوا کے بنتے اور بگڑتے رستوں میں ٹھہرے
اور خاک ہوئے
نیلے اور اتھاہ سمندر کے ہونٹوں کی پیاس بنے
آنے والے دن کی آنکھوں میں لہراتی آس بنے
کیسے کیسے رنگ تھے جو مٹی سے چمکے
اور چمک کر پڑ گئے ماند!

کچھ سورج ہیں ایسے پھر بھی

اپنی اپنی شام میں جو اِس دشتِ افق کا رزق ہُوے پر

روشن ہیں، گہنائے نہیں

پھول ہیں جن کو چھونے والی سبز ہوائیں خاک ہُوئیں

لیکن اب تک تازہ ہیں، کملائے نہیں

ایسا ہی اک سورج تھا وہ آدم زادہ

ٹوٹی اینٹوں کے ملبے سے

ایک عمارت کی بنیادیں ڈال رہا تھا

سات سمندر جیسے دل میں

اُن کے غم کو پال رہا تھا

جن کے کالے تنگ گھروں میں کوئی سورج چاند نہیں تھا

پھولوں کی مہکار نہیں تھی بادل کا امکان نہیں تھا

صبح کا نام نشان نہیں تھا

۵۲

نیند بھری آنکھوں کے رَن میں
وہ خود سورج بن کر اُبھرا
ڈھلتی شب میں پورے چاند کی صورت نکلا
صبح کے پہلے دروازے پر دستک بن کر گونج اُٹھا۔

آج میں جس منزل پہ کھڑا ہوں
اس پر پیچھے مُڑ کر دیکھوں
تو اک روشن موڑ پہ اب بھی
وہ ہاتھوں میں
آنے والے دن کی جلتی مشعل تھامے
میری جانب دیکھ رہا ہے
جانے وہ کیا سوچ رہا ہے!

۱۹۷۶ء

غزل

تم سے بچھڑ کر پہروں سوچتا رہتا ہوں
اب میں کیوں اور کس کی خاطر زندہ ہوں

اے خاموش خلا کے مالک تیری قسم
بزمِ جہاں میں تجھ سے زیادہ تنہا ہوں

جیتی جاگتی دنیا کے ہنگاموں میں
یوں لگتا ہے جیسے میں اک سایا ہوں

کھویا ہے وہ جیسے ہاتھ لکیروں میں
ایسے اپنے ہاتھ کو تکتا رہتا ہوں

ریزہ ریزہ ٹوٹ چکا ہوں اندر سے
گھر سے باہر گردن تان کے چلتا ہوں

جانے جس کا نام ہے امجدؔ، کون ہے وہ
سچ پوچھو تو میں اِک جھوٹا چہرہ ہوں

۱۹۷۶ء

لفظِ پسِ لفظ

کس قدر لفظ ہیں
جو ہم بولتے ہیں، رولتے ہیں
کون سا لفظ ہے کھولے گا جو درِ معنی کا،
اس کا پتہ کون کرے!
تم تو خوشبو ہو، ستاروں کی گزرگاہ ہو تم!
تم کہاں آؤ گے اس دشتِ پُر اسرار کی پہنائی میں!
کیسے اُترو گے تمناؤں کی گہرائی میں!

رہ گیا مَیں — !

سوائے جانِ وفا

میں تو جو کچھ ہوں تمھارے ہی خمِ چشم سے ہوں
تم ہی جب لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں
کس طرح سحرِ مفاہیم کا دروازہ کھُلے
لفظ کی کوکھ میں تاثیر کہاں سے اُترے

تم مرے ساتھ ہو، ہمراہ نہیں !
کون سے خواب کے جگمگ میں نہاں ہیں ہم تم !
کیسے گرداب تمنّا میں رواں ہیں ہم تم !
لفظ کے پار جو دیکھیں تو کوئی راہ نہیں
اور تم لفظِ پسِ لفظ سے آگاہ نہیں ۔

۱۹۷۶ء

عجیب رَو ہے خیال کی بھی

ابھی میں دنیا کے نیم گولے کی بے کرانی میں ابنِ آدم
کی ناتوانی کی، کامرانی کی داستاں میں بھٹک رہا تھا
ابھی کسی اجنبی شناسا کا ایک جملہ
سماعتوں کے گھنے شجر میں
فراق کوئل کی کُوک بن کر چمک اُٹھا ہے!

عجیب رَو ہے ملال کی بھی

۱۹۷۶ء

نظم

وقت سے کون کہے، یار، ذرا آہستہ

گر نہیں وصل تو یہ خوابِ رفاقت ہی ذرا دیر رہے،

وقفۂ خواب کے پابند ہیں

جب تک ہم ہیں!!

یہ جو ٹوٹا تو بکھر جائیں گے سارے منظر

(تیرگی زاد کو سورج ہے فنا کی تعلیم)

ہست اور نیست کے مابین اگر

خواب کا پُل نہ رہے

کچھ نہ رہے

وقت سے کون کہے،

یار، ذرا آہستہ!

۱۹۷۶ء

غزل

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل، لوٹ کے گھر جانا ہے

اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اسے، اصل میں مر جانا ہے

بول اے شامِ سفر، رنگِ رہائی کیا ہے؟
دل کو رکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے

کون اُبھرتے ہوئے مہتاب کا رستہ روکے
اس کو ہر طور سوئے دشتِ سحر جانا ہے

میں کھلا ہوں تو اسی خاک میں ملنا ہے مجھے
وہ تو خوشبو ہے، اسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

۱۹۷۵ء

دو مختصر نظمیں

تلازمہ

خواب آئینہ صفت
آئینے، سیماب صفت
اور سیماب اُبھرتے ہوُے مہتاب صفت
عکس در عکس بھی ہیں، عکس سے محروم بھی ہیں
اور دیکھو تو یہی زیست کا مقسوم بھی ہیں

۱۹۷۵ء

چاند کی موت

اپنا روپ دیکھ کر ٹھہر گیا
اس کے بعد جھیل میں اتر گیا

غزل

دل میں لاوا اُبل رہا ہے کیا؟
کوئی کہسار جل رہا ہے کیا؟

خوابِ فردا! زمیں پہ ظاہر ہو
میری آنکھوں میں پل رہا ہے کیا!

چشمِ شبنم — سفیرِ غنچہ بن
یوں ہوا بن کے چل رہا ہے کیا!

آ شریکِ غمِ خدائی ہو
اپنی وحدت میں گل رہا ہے کیا!

اتنے آسودہ کیوں ہیں اہلِ سفر
سر سے طوفان ٹل رہا ہے کیا؟

کس لیے بدحواس ہیں تارے
کوئی سورج نکل رہا ہے کیا؟

کیوں ہوا اس قدر رُکی سی ہے
کوئی طوفان پل رہا ہے کیا؟

کاٹ کر پھینک دے انھیں امجدؔ
ایسے ہاتھوں کو مل رہا ہے کیا!

۱۹۷۵ء

طلسمِ سفر

گزر گئی ہیں جو راتیں اُنھیں گزرنا تھا ــــ

اگر ہے فرق وصال و فراق میں ــــ کیا ہے!

خبر تمھیں بھی نہیں ہے مجھے بھی علم نہیں

مگر یہ کیسی کسک ہے؟

ہوا کا رنگ درختوں پہ حرف لکھتا ہے

سکوں کے حرف کہ جیسے سفر تمام ہُوا

مثالِ موجِ شکستہ، فرازِ ساحل پر

کچھ ایسے تھک کے گرے ہیں کہ جیسے جزر کا ہاتھ

کرے گا اب نہ تلاطم سے آشنا ہم کو ــ

مگر یہ کیسی چمک ہے؟

بکھرتے جھاگ کی اُنگلی سے ریگِ ساحل پر

بھنور کی آنکھ کے منظر دکھا رہی ہے مجھے ــ

طلوعِ صبحِ ازل سے غروبِ محشر تک
ہر ایک چیز طلسمِ سفر کی قیدی ہے
کہیں نہیں ہے ٹھکانہ ہوائے صحرا کا،
یہ جس پڑاؤ کو منزل سمجھ رہے ہیں ہم
اسے بھی ریگِ رواں کی مثال ہونا ہے
یہ ایک لمحۂ پرّاں بھی تتلیوں کی طرح
ہتھیلیوں پہ فقط رنگ چھوڑ جائے گا
ترے جمال کے، میرے فشارِ شوق کے رنگ
گلوئے اہلِ محبّت، نشانِ طوق کے رنگ
ہر ایک خواب کا جادو ہے آنکھ کھلنے تک!
ہزار پا ہے جو خواہش گریز پا ہوگی
تو کیوں نہ ہم اسی جادو کو جاوداں کرلیں
ہتھیلیوں میں چھپا کر بھٹکتے رنگوں کو
اسی وصال کے لمحے کو بے کراں کرلیں۔

١٩٧٥ء

سالگرہ

برتھ ڈے کیک پہ جلتی ہُوئی شمعوں کے بجھا دینے سے
کب بجھیں گے یہ شب و روز و مہ و سال کے انگار، جنھیں
چھُو نہ سکا
وقت کا سیلِ رواں
وقت کا سیلِ رواں جس کے خم و پیچ میں گُم ـــ
ہم اور تم
ہم اور تم سے ہزاروں لاکھوں ـــ
گُم سُم

آج کی رات،

میں نے ہر سال اسی طور سے کاٹی ہے کہ جیسے کوئی

قید خانے میں کرے عہدِ اسیری کا حساب

کرچیاں ہوتے ہوئے خواب چُنے — اور سُنے

دشتِ احساس میں آہٹ کے سراب

کون، کب، کون سی منزل پہ ملا

کس طرح بچھڑا، کہاں پر بچھڑا

دوست کس طور ہوئے دشمنِ جاں

غیر کس طرح ہوئے سانس کی خوشبو جیسے

کس کو فرصت ہے کرے، ان کا حساب

اور اگر ہو بھی تو اس کام میں رکھا کیا ہے

آخر کار وہی سیلِ رواں ہوگا جواب!

وقت کا سیلِ رواں

جس کے اُس پار کہیں رکھی ہے!

گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب

اور اِس پار فقط ۔ خواب ہی خواب

جو بھی رُت آئے کِھلا کرتے ہیں

تیری یادوں کے کنول، تیری جدائی کے گلاب

۱۹۷۵ء

غزل

اب کے سفر ہی اور تھا، اور ہی کچھ سراب تھے
دشتِ طلب میں جا بجا، سنگِ گرانِ خواب تھے

حشر کے دن کا غلغلہ، شہر کے بام و در میں تھا
نگلے ہُوئے سوال تھے، اُگلے ہُوئے جواب تھے

اب کے برس بہار کی، رُت بھی تھی انتظار کی
لہجوں میں سیلِ درد تھا، آنکھوں میں اضطراب تھے

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نکل گئے
پھُولوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے

سیل کی رہگزر رہے ہُوئے، ہونٹ نہ پھر بھی تر ہُوئے
کیسی عجیب پیاس تھی، کیسے عجب سحاب تھے

عمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہو گئی
جسم تھا اور عذاب تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

صبح ہُوئی تو شہر کے، شور میں یوں بکھر گئے
جیسے وہ آدمی نہ تھے، نقش و نگارِ آب تھے

آنکھوں میں خون بھر گئے، رستوں میں ہی بکھر گئے
آنے سے قبل مر گئے، ایسے بھی انقلاب تھے

ساتھ وہ ایک رات کا، چشمِ زدن کی بات تھا
پھر نہ وہ التفات تھا، پھر نہ وہ اجتناب تھے

ربط کی بات اور ہے، ضبط کی بات اور ہے
یہ جو فشارِ خاک ہے، اس میں کبھی گلاب تھے

ابر برس کے کھُل گئے، جی کے غبار دھل گئے
آنکھ میں رُونما ہُوئے، شہر جو زیرِ آب تھے

درد کی رہگزار میں، چلتے تو کس خمار میں
چشم کہ بے نگاہ تھی، ہونٹ کہ بے خطاب تھے

۱۹۷۵ء

ساتواں در

ناگزیر

یہ رات اپنے سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کر لے
میں تیرگی کا غبار بن کر نہیں جیوں گا

مجھے پتہ ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں کٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے زور ٹکروں سے
فصیلِ دہشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں کہ میرا شعلہ چمک کے رزقِ غبار ہو گا
تو بے خبر یہ دیار ہو گا

ساتواں در

۱۷

میں روشنی کی لکیر بن کر کسی ستارے کی مثل بکھروں گا

بستیوں کو خبر نہ ہو گی

میں جانتا ہوں کہ میری کم تاب روشنی سے سحر نہ ہو گی

مگر میں پھر بھی سیاہ شب کا غبار بن کر نہیں جیوں گا

کرن ہو کتنی نحیف لیکن کرن ہے پھر بھی،

وہ ترجماں کہ روشنی کا وجود زندہ ہے

اور جب تک

یہ روشنی کا وجود زندہ ہے رات اپنے

سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کر لے،

کہیں سے سورج نکل پڑے گا۔

۱۹۷۵ء

غزل

شبِ فراق کی خوشبو غروبِ شام میں تھی
زمین دنگ، ستاروں کے ازدحام میں تھی

ہمیں خود اپنے تجسّس سے ہیں گلے کیا کیا
وہ بات اُس میں نہیں تھی جو اُس کے نام میں تھی

تجھے تلاشنا جیسے اُفق کو چھُونا تھا!
وہی سفر میں تھی حالت کہ جو قیام میں تھی

نگاہِ خاص جو ہوتی تو دیکھتا کوئی
وہ ایک بات جو تیری نگاہِ عام میں تھی

تمام رنگ اُڑے جا رہے تھے اُس کی طرف
عجب طرح کی کشش آفتابِ شام میں تھی

چمک رہا تھا ہواؤں کی آستیں پہ لہو
اِدھر زمین بہاروں کے اہتمام میں تھی

یہ کس نے لوٹ لیے قافلے ستاروں کے
سحر کی تیغ تو امجدؔ ابھی نیام میں تھی

۱۹۷۵ء

ایک اور سفر

کب تک آنکھیں میچ کے بیٹھوں
پاگل اور مونہہ زور ہوا کے رستے ہیں ــــ!
چاروں جانب
گئے ہوؤں کے نقشِ کفِ پا ــــ نقشِ فنا ہیں!
گردباد کے خیمے دل کے صحراؤں میں اُترے ہیں
آوازوں کا
گئے ہوؤں کی آوازوں کا
درد الاؤ بجھنے کو ہے،
حدِّ نظر تک ــــ اُفق اُفق پر ــــ روشنیوں کا نام نہیں ہے
تاریکی میں کس کو خبر ہے کون کہاں رہ جائے

آؤ،

اس سے پہلے، آخری شعلہ بھی مر جائے

آؤ،

اِک دوجے میں اپنے اپنے چہرے دیکھیں اور پہچانیں

یہ پہچان کا شعلہ ہی اب رختِ سفر ہے

شب کے کالے صحراؤں میں کس کو خبر ہے،

صبح کدھر ہے۔!!

گئے ہوؤں کی آوازوں کا درد الاؤ بجھنے کو ہے

اس سے پہلے آخری شعلہ بھی مر جائے،

آؤ چلیں۔!

۱۹۷۵ء

غزل

کس قدر زخم زخم چہرا ہے
چاند بھی آدمی سا لگتا ہے

اس کے دل میں بھی چور ہے شاید
وہ بھی نظریں جھکا کے گزرا ہے

اِس طرف میں ہوں، اُس طرف تم ہو
بیچ میں زندگی کا میلا ہے

زر کی افراط ہو گئی ہے بہت
ہر گھڑی دل کا بھاؤ گرتا ہے

ساتواں در

جیسے سچ مچ اسے بہت غم تھا
اس طرح اس نے حال پوچھا ہے

اس قدر مہربان ہے دنیا
زندہ رہنا عذاب لگتا ہے

تم نے اچھا کیا جو لوٹ آئے
بارشوں کے سفر میں خطرا ہے

ق

اس قدر قرض ہے محبت کا
سوچتا ہوں تو ہول اُٹھتا ہے

عشق کے واجبات کیسے دوں
تم نے کیا میرے پاس چھوڑا ہے

ق

اتنے مصروف ہو گئے ہیں ہم
وقت ٹھہرا ہُوا سا لگتا ہے

آرزو، ماورائے وقت نہیں
مل بھی جاؤ اگر، تو اب کیا ہے

—

کٹ کے نخلِ فلک سے اے امجدؔ
تارا کھلتا ہے یا بکھرتا ہے ؟

۱۹۷۵ء

احمد ندیم قاسمی

میں نے اُس شخص کی آنکھوں میں فروزاں دیکھی
اُس کے نکھرے ہوئے باطن کی چمک
اُس کی تحریر کی خوشبو میں گل افشاں دیکھی
اُس کے مہکے ہوئے لہجے کی کھنک
اُس کے کردار کے پردے میں نمایاں دیکھی
عظمتِ آدمِ خاکی کی جھلک

اُس نے بتلایا مجھے ،
کیسے فن کار کا فن ،
اُس کے احساس کی قوّت سے جنم لیتا ہے
اُس نے سکھلایا مجھے
کس طرح کوئی زمانے کو مسرّت دے کر
اپنے حصّے میں الم لیتا ہے
آسماں ، کون سے لوگوں کے قدم لیتا ہے !

۱۹۷۴ء

غزل

گزر گیا جو زمانہ اسے بھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا اسے مٹا ہی دو
کھلے گا ترکِ تعلق کے بعد بابِ فنا
یہ ایک آخری پردہ بھی اب اٹھا ہی دو
رکی رکی سی ہوا ہے تھکا تھکا ہے چاند
وفا کے دشت میں حیراں کھڑے ہیں راہی دو
گزر رہا ہے جو لمحہ اسے امر کر لیں
میں اپنے خون سے لکھتا ہوں تم گواہی دو
کسی طرح سے تغافل کا باب تک تو کھلے
نہیں ہیں پیار کے قابل تو کچھ سزا ہی دو
میں کائنات کو تم سے نجات دے دوں گا
مری گرفت میں اک دن اگر تباہی دو

۱۹۷۴ء

غزل

رواں دواں ہے سفر، پیش و پس نہیں معلوم
قفس میں رہتے ہیں، حدِّ قفس نہیں معلوم

ملوں تو تا بہ ابد اس کو چومنا چاہوں
کہاں بچھڑتے ہیں عشق و ہوس، نہیں معلوم

سکوتِ شام میں زنجیر سی چھنکتی ہے
یہ سانس ہے کہ صدائے جرس نہیں معلوم

نشاطِ وصل کا لمحہ عجیب لمحہ تھا
کہاں رہا ہوں میں اتنے برس، نہیں معلوم

زمیں کی قید میں مَیں ہوں، یہ میری قید میں ہے
کہاں پہ گھر ہے، کہاں ہے قفس، نہیں معلوم

زمیں کے رنگ تھے جتنے، فنا پذیر ہوئے
جلی ہے کس لیے شمعِ نفس، نہیں معلوم

ٹپک رہا ہے سماعت میں کچھ نہ کچھ امجد
غمِ حیات کا سم ہے کہ رس، نہیں معلوم

۱۹۷۴ء

طلسمِ خاک

ہم کہ اس خاک سے تخلیق ہوئے
خاک کا رزق بنیں گے اک دن
خاک کا روپ ہیں ہم، خاک ہمارا درشن
جو بھی اس کارگہِ ہست میں "موجود" نظر آتا ہے
خاک کا وہم ہے، مٹی کا گماں ہے، آنکھیں
خواب میں دیکھے ہوئے خواب کی تصویریں ہیں
ایک ہی عکس ہے جن میں حاضر
خاک کے جوہرِ بے نام کا عکس

ایک جانے ہُوئے گمنام کا عکس
آئینہ خاک کا ٹوٹے تو رہا ہوں ہم تم !
اپنے سایوں سے جُدا ہوں ہم تم !

تم ملے بھی تو مجھے خاک کے جادے میں ملے
جادۂ خاک کہ جس کا نہ ازل ہے نہ ابد
تم مجھے میرے ہی کمزور ارادے میں ملے
خاک ہے جس کی سند
اس نمائش گہہِ ہستی کے سفر سے ہم تم
دُوریاں پہنے ہُوئے یونہی گزر جائیں گے
زادۂ خاک ہیں، چپ چاپ بکھر جائیں گے
ہم کہ اس خاک سے تخلیق ہُوئے ۔

۱۹۷۴ء

غزل

وہی ہے درد کا عالم اسے بھلا کر بھی
مرے قریب ہی نکلا وہ دور جا کر بھی

پیئے ہیں سات سمندر مگر وہی ہے پیاس
نگاہ بھرتی نہیں ہے کسی کو پا کر بھی

الگ الگ سہی دنیا کا اور دوست کا غم
کبھی یونہی ذرا دیکھو انھیں ملا کر بھی

عجیب قحط پڑا اب کے سال اشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہوئی خون میں نہا کر بھی

ہر ایک شے تری رحمت کے گیت گاتی ہے
اگر ہے سچ تو کبھی اے مرے خدا، کر بھی

فنا کا عکس ہے شبنم میں، گُل کا عکس نہیں
نگاہ کر کبھی اس آئینے میں آ کر بھی

زمیں کا سانس رُکا ہے ترے اشارے پر
کبھی تو دیکھ ادھر اک نظر اُٹھا کر بھی

بگولے رقص کو اُٹھے ہوا نے تالی دی
سکون مل نہ سکا بستیوں سے جا کر بھی

ہر ایک قید کی کوئی اخیر ہے امجد
نفس کو خاک کے جادو سے اب رہا کر بھی

۱۹۷۴ء

غزل

رُتوں کے ساتھ دلوں کی وہ حالتیں بھی گئیں
ہوا کے سنگ ہوا کی امانتیں بھی گئیں

ترے کہے ہوئے لفظوں کی راکھ کیا چھیڑیں
ہمارے اپنے قلم کی صداقتیں بھی گئیں

جو آئے جی میں پکار و مجھے، مگر ہے یوں
کہ اس کے ساتھ ہی اس کی محبتیں بھی گئیں

عجیب موڑ پہ ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے وحشتیں بھی گئیں

یہ کیسی نیند میں ڈوبے ہیں آدمی امجدؔ
کہ ہار تھک کے گھروں سے قیامتیں بھی گئیں

۱۹۷۴ء

عکس کا خوف

کُتّے بھونکتے ہیں
راتوں کو جب کہیں اچانک کُتّے بھونکتے ہیں
تو میرا دل اک ایسے خوف سے بھر جاتا ہے
جس کا کوئی نام نہیں۔
اِن کی کالی آوازوں سے
میرے اندر سونے والا اک کتّا بھی جاگ اُٹھتا ہے
لالچ، وہم اور خوف کا کتّا۔

باہر بھونکنے والے کُتّے تھک جاتے ہیں۔
پر یہ اندر بھونکنے والا کتا جاگتا رہتا ہے۔

۱۹۷۴ء

غزل

چپکے چپکے ہی اثر کرتا ہے
عشق کینسر کی طرح بڑھتا ہے

رات کے پچھلے پہر تاروں ہیں
ایک ہنگامہ مچا رہتا ہے

گھر سے بھاگے ہُوئے بچے کی طرح
دل بہرِ شہرِ وفا تنہا ہے

خواب ہیں جس سے پریشان تھے ہم
آنکھ کھولی تو وہی نقشہ ہے

۹۱

ق

کون سُنتا ہے کسی کی بپتا
سب کے ماتھوں پہ یہی قصّہ ہے

کوئی ڈرتا ہے بھری محفل میں
کوئی تنہائی میں ہنس پڑتا ہے

یہی جنّت ہے یہی ہے دوزخ
اور دیکھو تو یہی دنیا ہے

سب کی قسمت میں فنا ہے، جب تک
آسمانوں پہ کوئی زندہ ہے

وہ خدا ہے تو زمیں پر آئے
حشر کا دن تو یہاں برپا ہے

سانس روکے ہُوئے بیٹھو امجدؔ
وقت دشمن کی طرح چلتا ہے

۱۹۷۴ء

محبّت کی ایک نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا۔
اگر وہ نخلِ فلک سے اُڑ کر تمھارے قدموں میں آگرے تو
یہ جان لینا، وہ استعارہ تھا میرے دل کا،
اگر نہ آئے....
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو
تو اُس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے!

اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمھیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتّیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئنوں میں تمھیں ملوں گا۔
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خوشبوؤں میں، نہ پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمھیں ملوں گا۔
کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں
تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی خاک دریا میں ڈال دینا
میں خاک بن کر سمندروں میں سفر کروں گا۔
کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رُک کے تم کو صدائیں دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اُس جزیرے پہ بھی اُترنا۔

۱۹۷۴ء

غزل

نہ آسماں سے نہ دشمن کے زور و زر سے ہُوا
یہ معجزہ تو مرے دستِ بے ہُنر سے ہُوا

قدم اُٹھا ہے تو پاؤں تلے زمیں ہی نہیں
سفر کا رنج ہمیں خواہشِ سفر سے ہُوا

میں بھیگ بھیگ گیا آرزو کی بارش میں
وہ عکس عکس میں تقسیم چشمِ تر سے ہُوا

سیاہی شب کی نہ چہروں پہ آگئی ہو کہیں
سحر کا خوف ہمیں آئنوں کے ڈر سے ہُوا

کوئی چلے تو زمیں ساتھ ساتھ چلتی ہے
یہ راز ہم پہ عیاں گردِ رہگزر سے ہُوا

ترے بدن کی مہک ہی نہ تھی تو کیا رُکتے
گزر ہمارا کئی بار یوں تو گھر سے ہُوا

کہاں پہ سوئے تھے امجد کہاں کھلیں آنکھیں
گماں قفس کا ہمیں اپنے بام و در سے ہُوا

۱۹۷۴ء

جال

جب مرے پاس تھے تم

میں نے کئی بار یہ سوچا، تم سے

آنکھ میں بکھرے ہوئے خواب کا احوال کہوں

کیسے کٹتے ہیں مرے روز و مہ و سال کہوں

فیصلے اور عمل میں لیکن

ایک دیوار جو صدیوں سے کھڑی ہے، میں بھی

اُس میں روزن ہی بنانے کی تگ و دو میں رہا

سعیِ بیکارِ تمنّا کی قلمرو میں رہا

اب جو تم بچھڑے ہو تو
دن رات مرے دل میں عجب وہم سا رہتا ہے
کہ جیسے میں نے،
یونہی اک خوف کو دیوار بنا رکھا تھا
دل کو اک نقطۂ پرکار بنا رکھا تھا۔
سوچتا ہوں کہ اگر میں نے کبھی
تم کو اُس خواب کا احوال سُنایا ہوتا، تو بھلا کیا ہوتا!
حد سے حد تم مری باتوں سے خفا ہو جاتے
اک تمسخر کی ہنسی ہنس کے جُدا ہو جاتے۔!!

۱۹۷۴ء

غزل

جو دوست ہی نہ رہا، اس سے اب گلہ کیا ہے
مرے خدا! یہ محبت کا سلسلہ کیا ہے!

چلو توسیل کی صورت نظر جھکا کے چلو
بلند و پست جو دیکھے وہ حوصلہ کیا ہے!

صدائے نکہتِ غنچہ! کہیں قیام تو کر
پتہ چلے تو سہی کچھ معاملہ کیا ہے!

کرن کرن اسے ڈھونڈا، صدف صدف دیکھا
اگر ہے سعیِ مسلسل کا کچھ صلہ، کیا ہے؟

وہ شخص جا بھی چکا ہے، بہار ہو بھی چکی
مگر یہ پھول سرِ شاخِ دل، کھلا کیا ہے!

١٩٧٤ء

جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے
تیرے میرے ابد کا کنارا ہے یہ
استعارہ ہے یہ

روپ کا داؤ ہے
پیار کا گھاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

صبح دم جس گھڑی پھول کی پنکھڑی
اوس کا آئنہ جگمگانے لگا،

ایک بھنورا وہیں دیکھ کر ہر کہیں
شاخ کی اوٹ سے سر اُٹھانے لگا

پھُول، بھنورا، تلاطم ہے، ٹھہراؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

خواب کیا کیا چُنے، جال کیا کیا بُنے
موج تھمتی نہیں، رنگ رکتے نہیں

وقت کے فرش پر، خاک کے رقص پر
نقش جمتے نہیں، ابر جھکتے نہیں

ہر مسافت کی دوری کا سمٹاؤ ہے
جو بھی کچھ ہے محبّت کا پھیلاؤ ہے

غزل

سانسوں میں اشتعال سا آیا ہُوا تو ہے
موسم شبِ وصال سا آیا ہُوا تو ہے

بیٹھے بٹھائے سُرخ ہُوئے کان کس لیے
دل میں کوئی خیال سا آیا ہُوا تو ہے

لکھتے ہیں آستینِ ہوا پر کہانیاں
ہاتھوں میں یہ کمال سا آیا ہُوا تو ہے

کاخِ بلند بام کو شاید خبر نہیں
بنیاد میں زوال سا آیا ہُوا تو ہے

ڈرتا ہوں آسمان کا جادو نہ ٹوٹ جائے
لب تک کوئی سوال سا آیا ہُوا تو ہے

امجدؔ جدائیوں کی یہ تمہید تو نہیں
لہجوں میں پھر ملال سا آیا ہُوا تو ہے

غزل

نکل کے حلقۂ شام و سحر سے جائیں کہیں
زمیں کے ساتھ نہ مل جائیں یہ خلائیں کہیں!

سفر کی رات ہے پچھلی کہانیاں نہ کہو!
رُتوں کے ساتھ پلٹتی ہیں کب ہوائیں کہیں

فضا میں تیرتے رہتے ہیں نقش سے کیا کیا!
مجھے تلاش نہ کرتی ہوں یہ بلائیں کہیں

ہوا ہے تیز، چراغِ وفا کا ذکر تو کیا
طنابیں خیمۂ جاں کی نہ ٹوٹ جائیں کہیں

میں اوس بن کے گلِ حرف پر چمکتا ہوں
نکلنے والا ہے سورج، مجھے چھپائیں کہیں

مرے وجود پہ اُتری ہیں لفظ کی صورت
بھٹک رہی تھیں خلاؤں میں یہ صدائیں کہیں

ہوا کا لمس ہے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
شفق کی آنچ سے آنکھیں پگھل نہ جائیں کہیں

رُکا ہُوا ہے ستاروں کا کارواں امجد
چراغ اپنے لہو سے ہی اب جلائیں کہیں

۱۹۷۳ء

سواگت

ملن کا سورج چمک رہا ہے!
دلوں کی صورت وطن کی مٹی کا ذرّہ ذرّہ دھڑک رہا ہے!
ملن کا سورج چمک رہا ہے!

ملاپ ساعت کا نیک قاصد خبر دریچوں سے ہو کے گزرا
تو آرزو سے بھری نگاہوں نے اُس کے قدموں میں گل بچھائے
گئی رُتوں کی دبیز چلمن سے مسکرائے

ضعیف آنکھوں کے نور، ہاتھوں سے دُور، تارے

وہ جان پارے!

وہ پھُول (جن پر گئے ہوؤں کی خیال شبنم لرز رہی تھی)

بہار قدموں کی چاندآہٹ سے کھل اُٹھے ہیں

وہ خواب (جن پر مفارقت کی سیاہ چادر لٹک رہی تھی)

حقیقتوں میں بدل گئے ہیں

پلک جھپکنے میں غم کے بادل ہوا ہوئے ہیں

عجیب دروازے وا ہُوئے ہیں!

غنیم سرحد سے آنے والوں کو ہو مبارک

کہ حوصلوں کے اس امتحاں میں وہ سرخرو ہیں

اُنھیں مبارک کہ اُن کے پاؤں وطن کی مٹی کو چھُو رہے ہیں

وطن کی مٹّی جو اپنی ہستی کا مدّعا ہے

جو ابتدا ہے۔ جو انتہا ہے!

اُنھیں مبارک کہ اُن کے عزم و وفا کا شعلہ
ہر ایک گھر میں بھڑک رہا ہے
دلوں کی صورت
وطن کی مٹی کا ذرّہ ذرّہ دھڑک رہا ہے
ملن کا سورج چمک رہا ہے

۱۹۷۳ء

غزل

بام و در سے ہی بات کی جائے
رائیگاں کیوں یہ رات کی جائے

پیاس پھر بستیوں میں اُتری ہے
گفتگوئے فرات کی جائے

پتھّروں سے خطاب کیا کیجے
آدمی ہوں تو بات کی جائے

یا تو ترتیب دیں ستاروں کو
ختم یا کائنات کی جائے

آسماں دھم سے آ گرے نیچے
خاک اگر بے صفات کی جائے

صبح کی آس ہے نہ شام کا غم
جیسے زنداں میں رات کی جائے

توڑ دیں جال چاند تاروں کا
کوئی شکلِ نجات کی جائے

دسترس کے حصار سے آگے
سیرِ ناممکنات کی جائے

خاک کو خاک ہی میں ملنا ہے
کیوں خلاؤں کی بات کی جائے

مٹھیاں کھل رہی ہیں غنچوں کی
کچھ سبیلِ ثبات کی جائے

خاک کا سحر ٹوٹتا ہو جب
کیا بھری کائنات کی جائے

۱۹۷۳ء

غزل

آنکھوں میں بازدید کا ارمان رہ گیا
کیا چاند تھا کہ ہالۂ حرمان رہ گیا

خالی گھروں میں جس طرح آسیب سانس لے
دل میں کسی کا سایۂ پیمان رہ گیا

منظر جو دل پسند تھے، آگے نکل گئے
رستوں میں ایک دیدۂ حیران رہ گیا

آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے مسافر گزر گئے
چسپاں فصیلِ شہر پہ اعلان رہ گیا

زنجیرِ درد ٹوٹ گئی ہے، پہ قید ہوں
ہاتھوں میں ایک حلقۂ پیمان رہ گیا

ساحل کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا چاند
پہنچا جو پانیوں میں تو حیران رہ گیا

آئی بہار، باغ کی مٹی ہری ہوئی
امجد مگر وہ پیڑ کہ ویران رہ گیا

۱۹۷۳ء

غزل

میں بے نوا ہوں، صاحبِ عزّت بنا مجھے
اے ارضِ پاک اپنی جبیں پر سجا مجھے

جس پر رقم ہیں نقشِ کفِ پائے رفتگاں
اے عہدِ نا تمام، وہ رستہ دکھا مجھے

میں حرف حرف لوحِ زمانہ پہ درج ہوں
میں کیا ہوں! میرے ہونے کا مطلب سکھا مجھے

یا مجھ کو اپنا چہرۂ منزل نما دکھا
یا قیدِ صبح و شام سے کر دے رہا مجھے

میں موجِ شوقِ خام تھا لیکن ترے طفیل
دریا بھی اپنے سامنے قطرہ لگا مجھے

۱۹۷۲ء

غزل

ہر شخص کی خوں رنگ قبا ہے کہ نہیں ہے
یہ قتل گہہِ اہلِ وفا ہے کہ نہیں ہے

محرومِ جواب آتی ہے فریاد فلک سے
ان ظلم نصیبوں کا خدا ہے کہ نہیں ہے

اے قریۂ بے خواب تمنّا کے مکینو
اِس راہ کا اُس کو بھی پتا ہے کہ نہیں ہے

اک ریت کا دریا سا اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
صحرائے محبّت کا سرا ہے کہ نہیں ہے

آنکھوں کے لیے خواب ہیں شبنم کے لیے پھول
ہر چیز یہاں رشتہ بپا ہے کہ نہیں ہے

اک نسل کی تعزیر سہیں دوسری نسلیں
اے منصفِ برحق، یہ ہُوا ہے کہ نہیں ہے

بے رنگ ہُوئے جاتے ہیں آنکھوں کے جزیرے
طوفان کی یہ آب و ہوا ہے کہ نہیں ہے

امجدؔ جو رُکا اُس کی صدا پر، نہ چلا پھر
انسان کا دل کوہِ ندا ہے کہ نہیں ہے

۱۹۷۲ء

غزل

یہ دشتِ ہجر، یہ وحشت، یہ شام کے سائے
خدا یہ وقت تری آنکھ کو نہ دکھلائے!

اُسی کے نام سے لفظوں میں چاند اُترتے ہیں
وہ ایک شخص کہ دیکھوں تو آنکھ بھر آئے

جو کھو چکے ہیں اُنھیں ڈھونڈنا تو ممکن ہے
جو جا چکے ہیں اُنھیں کوئی کس طرح لائے

کلی سے میں نے گُلِ تر جسے بنایا تھا،
رُتیں بدلتی ہیں کیسے، مجھے ہی سمجھائے

جو بے چراغ گھروں کو چراغ دیتا ہے
اُسے کہو کہ مرے شہر کی طرف آئے

یہ اضطرابِ مسلسل عذاب ہے امجد
مرا نہیں تو کسی اور ہی کا ہو جائے؟

۱۹۷۲ء

غزل

چاند کے ساتھ کئی درد پرانے نکلے
کتنے غم تھے جو ترے غم کے بہانے نکلے

فصلِ گُل آئی، پھر اک بار اسیرانِ وفا
اپنے ہی خون کے دریا میں نہانے نکلے

ہجر کی چوٹ عجب سنگ شکن ہوتی ہے
دل کی بے فیض زمینوں سے خزانے نکلے

عمر گزری ہے شبِ تار میں آنکھیں ملتے
کس افق سے مرا خورشید نہ جانے نکلے

کوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھیگتی آنکھوں کو سجانے نکلے

دل نے اک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
تُو نے اک بات کہی، لاکھ فسانے نکلے

دشتِ تنہائیِ ہجراں میں کھڑا سوچتا ہوں
ہائے کیا لوگ مرا ساتھ نبھانے نکلے

میں نے امجدؔ اسے بے واسطہ دیکھا ہی نہیں
وہ تو خوشبو میں بھی آہٹ کے بہانے نکلے

۱۹۷۲ء

بستیاں راکھ ہوئی ہیں لیکن

ان زمینوں کی ہوا تند ہے، بچ کر چلنا
خون کا نشہ، نگاہوں میں اُتر آیا ہے
ہر حقیقت کا گماں
خوف اور طیش کی راہوں میں اُتر آیا ہے

موت پھر موت ہے، جب گھر سے نکل آتی ہے
آہٹیں بین کا آہنگ لیے چلتی ہیں
خواہشیں اپنا لہو، سنگ لیے چلتی ہیں

موت کی سرد ہَوا

شہرِ پُرشور کو بے صوت بنا دیتی ہے

آنے والوں کے سواگت میں فروزاں چہروں،

کھڑکیوں اور دریچوں میں بھٹکتی آنکھوں،

گرم سینوں میں تمنّا کے دہکتے شعلوں،

اور بے نام چراغوں کو بجھا دیتی ہے

راستے اندھے فقیروں کی طرح

کسی رہگیر کی آہٹ پہ لگے رہتے ہیں

اور ویران مکانوں کے در و بام سے ٹکرا کے ہَوا

جانے والوں کو صدا دیتی ہے

بستیاں راکھ ہُوئی ہیں لیکن —

کس پہ الزام دھریں

جلنے والوں میں ہی شامل ہیں جلانے والے

مرنے والے ہی جہاں مارنے والے ہوں، وہاں
کون بتلائے کہاں ظلم ہُوا، کس پہ ہُوا، کس نے کیا؟
تیغ بردوش ہیں سب زخم دکھانے والے!
سرخیٔ خوں سے مبرّا کوئی داماں نہیں
اب یہاں ظالم و مظلوم کی پہچان نہیں

۱۹۷۱ء

غزل

ترکِ الفت کا بہانہ چاہیے
وہ مجھے چھوڑ کے جانا چاہیے

اُس کی خواب خیالی دیکھو
آگ پانی میں لگانا چاہیے

کچھ نہیں اور تغافل ہی سہی
آرزو کوئی ٹھکانہ چاہیے

وقت دیوار بنا بیٹھا ہے
وہ اگر لوٹ بھی آنا چاہیے

کوئی آہٹ تھی نہ سایہ کوئی
دل تو رکنے کا بہانہ چاہے

میں وہ رستے کی سرائے ہوں جسے
ہر کوئی چھوڑ کے جانا چاہے

دیکھنا دل کی اذیّت طلبی
پھر اسی شہر کو جانا چاہے

۱۹۷۰ء

غزل

خزاں کے پھول کی صورت بکھر گیا کوئی
تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی

دروں دریچوں میں خلقت دکھائی دیتی ہے
نواحِ سنگ میں آشفتہ سر گیا کوئی!

ہوا نہ تھا یہ ہواؤں سا بے خبر تھا وہ
مجھے بٹھا کے سرِ رہ گزر گیا کوئی

گریز میں وہ توجّہ کا رنگ کیسا تھا!
اس اک سوال سے دامن کو بھر گیا کوئی

اسے گماں ہی نہ تھا جیسے میرے ہونے کا
مرے قریب سے یوں بے خبر گیا کوئی

غمِ حیات کے رستے عجیب تھے امجد
کسی نے رُک کے نہ دیکھا، کدھر گیا کوئی ۱۹۷۰ء

غزل

یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی، وہ نظر تو آیا ہے

کروں شکایتیں، تکتا رہوں کہ پیار کروں
گئی بہار کی صورت وہ لوٹ آیا ہے

وہ سامنے تھا مگر یہ یقیں نہ آتا تھا
وہ آپ ہے کہ مری خواہشوں کا سایا ہے

عذاب دھوپ کے کیسے ہیں، بارشیں کیا ہیں!
فصیلِ جسم گری جب تو ہوش آیا ہے

میں کیا کروں گا اگر وہ نہ مل سکا امجد
ابھی ابھی مرے دل میں خیال آیا ہے

۱۹۷۰ء

غزل

پھول کو رنگ ستارے کو ضیا کس نے دی!
اے غمِ دل، ترے ہونٹوں کو نوا کس نے دی!

جی اُسے دیکھ کے کیوں آج بھر آتا ہے
شعلۂ عرضِ تمنّا کو ہَوا کس نے دی!

دل کے دریا میں گیا جو بھی، وہیں ڈوب گیا
یہ نگرِ دھیان کی گلیوں سے صدا کس نے دی!

اپنی ہی شکل ہے، جس سمت نظر پڑتی ہے
شہرِ آئینہ میں آنکھوں کو سزا کس نے دی!

ہُو بہُو اس کی ہی آواز لگی ہے! دیکھو
وادیٔ سنگ میں امجدؔ یہ ندا کس نے دی!

۱۹۷۰ء

غزل

اوروں کا تھا بیان تو موجِ صدا رہے
خود عمر بھر اسیرِ لبِ مدّعا رہے

مثلِ حباب بحرِ غمِ حادثات میں
ہم زیرِ بارِ منّتِ آب و ہوا رہے

میں اُس سے اپنی بات کا مانگوں اگر جواب
لہروں کا پیچ و خم وہ کھڑا دیکھتا رہے

ق

گلشن میں تھے تو رونقِ رنگِ چمن بنے
جنگل میں ہم امانتِ بادِ صبا رہے
سُرخی بنے تو خونِ شہیداں کا رنگ تھے
روشن ہُوئے تو مشعلِ راہِ وفا رہے
اُبھرے تو ہر بھنور کا جگر چاک کر گئے
ٹھہرے تو موج موج کو اپنا بنا رہے

امجدؔ درِ نگار پہ دستک ہی دیجیے
اس بے کراں سکوت میں کچھ غلغلہ رہے

غزل

گفتگو میں یک بیک تبدیلیٔ آواز کیا!
خامشی میری ہے میرے درد کی غماز کیا؟

دشت میں سیلاب ہے اور شہر ہیں تشنہ دہن
دوستو، دیدہ ورو، اس بات میں ہے راز کیا؟

آدمی کیا، اب تو چلتے ہیں در و دیوار بھی
بھا گیا شہروں کو تیری چال کا انداز کیا؟

اس جہانِ کور و کر میں خاک ہے عرضِ ہنر
کیا دلِ الفت چشیدہ، رنگ کیا، آواز کیا؟

یہ زمینیں بے ثمر ہیں، راستے بے نور ہیں
کیا ہوائے موسمِ گل اور چشمِ باز کیا

جس طرف چاہو، چلو امجد، ہوائے شوق میں
کاروانِ بے جہت کے واسطے آغاز کیا

۱۹۶۹ء

غزل

عشّاق نہ پتھر نہ گدا کوئی نہیں ہے
اب شہر میں سایوں کے سوا کوئی نہیں ہے

بچھڑے ہُوے لوگوں کا پتہ کون بتائے
رستوں میں بجز بادِ بلا کوئی نہیں ہے

میں اپنی محبّت میں گرفتار ہُوا ہوں
اِس درد کی قسمت میں دوا کوئی نہیں ہے

بے بار چلا اب کے برس موسمِ گل بھی
اُس پھول کے کھلنے کی ادا کوئی نہیں ہے

ہر آنکھ میں افسوس نے جالے سے تنے ہیں
ماحول کے جادو سے رہا کوئی نہیں ہے

امجد یہ مرا دل ہے کہ صحرائے بلا ہے
مدّت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں ہے

۱۹۶۹ء

غزل

ہم ہی آغازِ محبّت میں تھے انجان بہت
ورنہ نکلے تھے ترے وصل کے عنوان بہت

آئنہ خانۂ حیرت ہے کہ آسیب ہے وہ
آنکھ میں رہ کے بھی کرتا ہے پریشان بہت

دل بھی کیا چیز ہے، اب پا کے اُسے سوچتا ہے
کیا اسی واسطے چھانے تھے بیابان بہت

اے غمِ عشق، مری آنکھ کو پتھّر کر دے
ہیں مرے سر پہ ترے اور بھی احسان بہت

فاصلے راہِ تعلّق کے مٹیں گے کیوں کر
حسن پابندِ انا، عشق تن آسان بہت

اس کو بھی لگ ہی گئی شہرِ محبّت کی ہَوا
وہ بھی امجد ہے کئی دن سے پریشان بہت

غزل

اب نگر ہے آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں
س کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہوں

کس کی آہٹ قریہ قریہ پھیل رہی ہے
دیواروں کے رنگ بدلتے دیکھ رہا ہوں

کون مرے جادو سے بچ کر جا سکتا ہے!
آئینہ ہوں، سب کے چہرے دیکھ رہا ہوں

دروازے پر تیز ہواؤں کا پہرا ہے
گھر کے اندر چپ کے سائے دیکھ رہا ہوں

جیسے میرا چہرہ میرے دشمن کا ہو
آئینے میں خود کو ایسے دیکھ رہا ہوں

منظر منظر ویرانی نے جال تنے ہیں
گلشن گلشن بکھرے پتّے دیکھ رہا ہوں

منزل منزل ہول میں ڈوبی آوازیں ہیں
رستہ رستہ خوف کے پہرے دیکھ رہا ہوں

شہرِ سنگدلاں میں امجد ہر رستے پر
آوازوں کے پتھّر چلتے دیکھ رہا ہوں

۱۹۶۹ء

غزل

(نذرِ غالب)

دیکھتا رہتا ہوں مَیں جو کچھ پریشانی کرے
فیصلے جب دل کے ہوں تو کیا ہنر دانی کرے

آنکھ میں منظر کا جالا، کان میں گردِ صدا
دشت کا ماحول پیدا خانہ ویرانی کرے

آرزو خود اپنے خوں سے انجمن پرداز ہے
دل بہ قیمت فروغِ جلوہ سامانی کرے

ایک تو اس کی نگاہوں نے کیا بے دست و پا
اس پہ یہ مشکل کہ اپنا دل بھی من مانی کرے

سامنے آیا ہے تو میرے رگ و پے میں اُتر
میں تو آئینہ نہیں جو صرف حیرانی کرے

کیا کہوں امجدؔ ہوائے اضطرابِ دید کو
دشتِ دل کو ایک پل میں شبنمستانی کرے

۱۹۶۹ء

غزل

ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی
مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی

منزلِ تمنا تک کون ساتھ دیتا ہے!
گمرہیِ سعیِ لاحاصل ہر سفر کی قسمت تھی

آپ ہی بگڑتا تھا، آپ من بھی جاتا تھا
اس گریز پہلو کی یہ عجیب عادت تھی

اس نے حال پوچھا تو یاد ہی نہ آتا تھا
کس کو کس سے شکوہ تھا کس سے کیا شکایت تھی

دشت میں ہواؤں کی بے رُخی نے مارا ہے
شہر میں زمانے کی پوچھ گچھ سے وحشت تھی

یوں تو دن دہاڑے بھی لوگ لوٹ لیتے ہیں
لیکن ان نگاہوں کی اور ہی سیاست تھی

ہجر کا زمانہ بھی کیا غضب زمانہ تھا
آنکھ میں سمندر تھا، دھیان میں وہ صورت تھی

۱۹۶۹ء

دو مختصر نظمیں

مشکل :

حصولِ لذّت گنہ نہیں ہے
مگر وہ رستے
جو لذّتوں کی طرف گئے ہیں
ازل سے لے کر ابد کی بے نام وسعتوں تک
گنہ کی منزل سے پھوٹتے ہیں

۱۹۶۸ء

روایت :

"نہیں" اور "ہے" کے اندھیرے سفر میں
ازل سے مسلسل چلا جا رہا ہوں
مگر آگے پیچھے وہی راستے ہیں
کئی بار جن سے گزر کر گیا ہوں
میں جیسے کسی دائرے میں گھرا ہوں۔

۱۹۶۸ء

غزل

کون سی منزل پہ لے آئی اکائی ذات کی
ٹوٹ جاؤں گا اگر میں نے کسی سے بات کی

ٹوٹتی کلیوں کے ماتم میں ہوا روتی رہی
پھول کے چہرے پہ لکھی ہے کہانی رات کی

ڈس گئیں میرے بدن کو رینگتی تنہائیاں
کھا گئیں اس کو بلائیں گردشِ حالات کی

بند ہے آنکھوں میں منظر اس کے جاتے وقت کا
نقش ہے تصویر دل پر کپکپاتے ہاتھ کی

خامشی گویا ہوئی، منظر زبانیں بن گئے
کب مجھے کچھ ہوش تھا کب اس نے کوئی بات کی

۱۹۶۸ء

غزل

دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی الجھن میں پڑا ہے کب سے

اے کڑی چپ کے در و بام سجانے والے!
منتظر کوئی سرِ کوہِ ندا ہے کب سے

چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا
اس کی دیوار پہ حیران کھڑا کب سے

بات کرتا ہوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چھپا ہے کب سے

شعبدہ بازیٔ آئینۂ احساس نہ پوچھ
حیرتِ چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے

دیکھیے خون کی برسات کہاں ہوتی ہے
شہر پہ چھائی ہوئی سرخ گھٹا ہے کب سے

کور چشموں کے لیے آئنہ خانہ معلوم!
ورنہ ہر ذرّہ ترا عکس نما ہے کب سے

کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے امجدؔ
ڈھونڈتی کس کو سرِ دشت ہوا ہے کب سے

۱۹۶۸ء

غزل

رات میں اس کشمکش میں ایک پل سویا نہیں
کل میں جب جانے لگا تو اس نے کیوں روکا نہیں

یوں اگر سوچوں تو اک اک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں

کیوں اُڑاتی پھر رہی ہے دربدر مجھکو ہَوا
میں اگر اک شاخ سے ٹوٹا ہُوا پتّا نہیں

درد کا رستہ ہے یا ہے ساعتِ روزِ حساب
سینکڑوں لوگوں کو روکا ایک بھی ٹھہرا نہیں

شبنمی آنکھوں کے جگنو، کانپتے ہونٹوں کے پھول
ایک لمحہ تھا جو امجد آج تک گزرا نہیں

۱۹۶۶ء

غزل

بند تھا دروازہ بھی اور گھر میں بھی تنہا تھا میں
تُو نے کچھ مجھ سے کہا یا آپ ہی بولا تھا میں؟

یاد ہے اب تک مجھے وہ بدحواسی کا سماں
تیرے پہلے خط کو گھنٹوں چومتا رہتا تھا میں

میری اُنگلی پر ہیں اب تک میرے دانتوں کے نشاں
خواب ہی لگتا ہے پھر بھی جس جگہ بیٹھا تھا میں

راستوں میں تیرگی کی یہ فراوانی نہ تھی
اس سے پہلے بھی تمھارے شہر میں آیا تھا میں

آج امجد خواب ہے میرے لیے جس کا خیال
کل اُسی کا ہاتھ تھامے گھومتا پھرتا تھا میں

غزل

سکوں محال ہے امجدؔ وفا کے رستے میں
کبھی چراغ جلے ہیں ہوا کے رستے میں؟

نجانے اب کے برس کھیتیوں پہ کیا گزرے!
کئی پہاڑ کھڑے ہیں گھٹا کے رستے میں

قدم قدم پہ قدم لڑکھڑائے جاتے ہیں
بتوں کے ڈھیر لگے ہیں خدا کے رستے میں

جہانِ نو کو شعورِ مسافرت دیں گے
ہم اپنے خون سے شمعیں جلا کے رستے میں

دیارِ اہلِ محبّت میں کس نے دی آواز
ہزار ساز بجے ہیں صدا کے رستے میں

سوائے دردِ محبّت، بجز غبارِ سفر
کوئی رفیق نہ پایا وفا کے رستے میں

۱۹۶۶ء

غزل

میں ازل کی شاخ سے ٹوٹا ہُوا
پھر رہا ہوں آج تک بھٹکا ہُوا

دیکھتا رہتا ہے مجھ کو رات دن
کوئی اپنے تخت پہ بیٹھا ہُوا

چاند تارے دور پیچھے رہ گئے
میں کہاں پر آگیا اُڑتا ہُوا

بند کھڑکی سے ہوا آتی رہی
ایک شیشہ تھا کہیں ٹوٹا ہُوا

کھڑکیوں میں، کاغذوں میں، میز پر
سارے کمرے میں ہے وہ پھیلا ہُوا

اپنے ماضی کا سمندر چھانیے
اک خزانہ ہے یہاں ڈوبا ہُوا

دوستوں نے کچھ سبق ایسے دیئے
اپنے سائے سے بھی ہوں سہما ہُوا

کس کی آہٹ آتے آتے رُک گئی
کس نے میرا سانس ہے روکا ہوا؟

۱۹۶۵ء
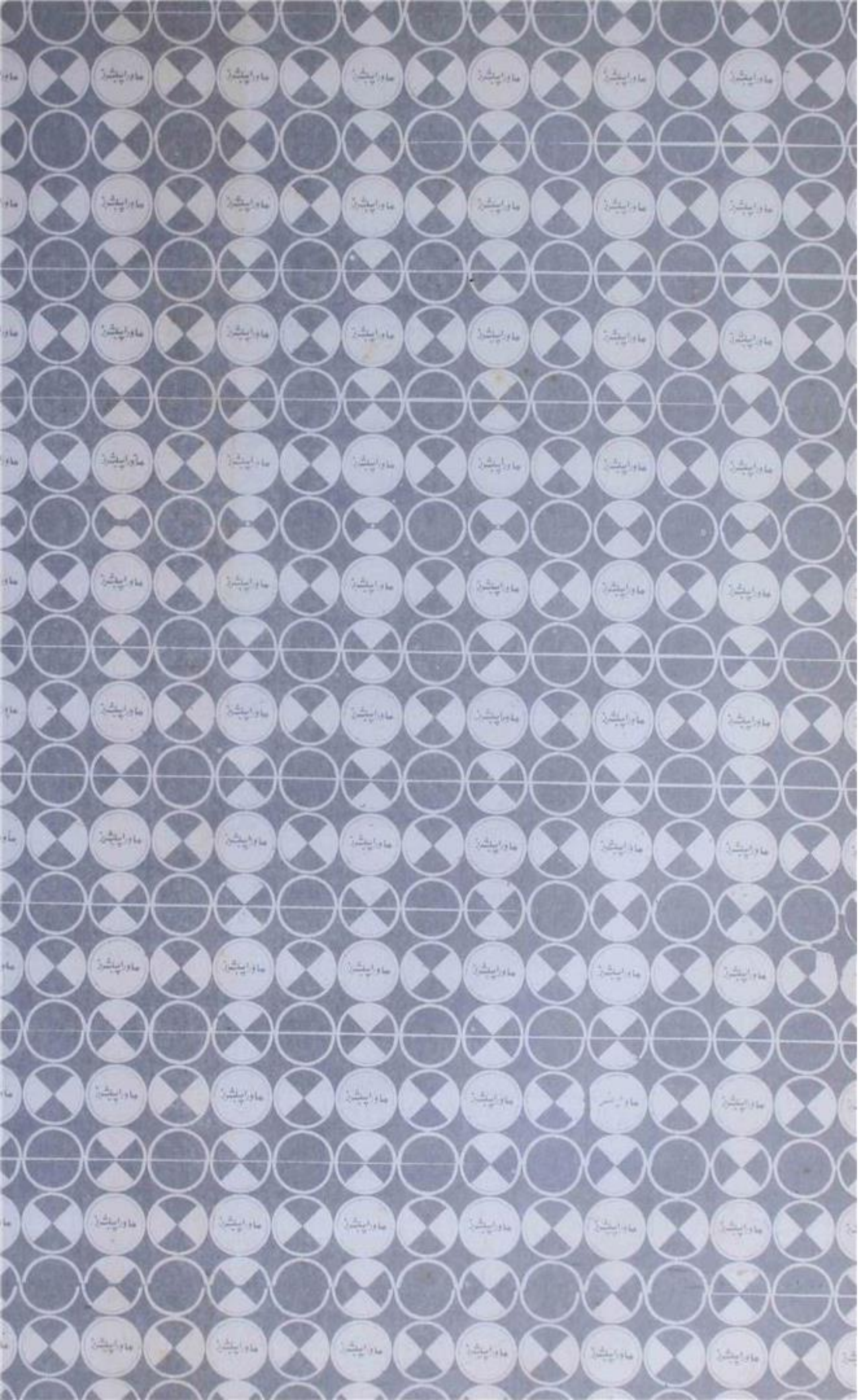
ڈرامے

۱۱- وارث

۱۲- دہلیز

۱۳- سمندر (زیرِ طبع)

۱۴- وقت (زیرِ طبع)

۱۵- رات (زیرِ طبع)

۱۶- خواب جاگتے ہیں (زیرِ طبع)

۱۷- اپنے لوگ (زیرِ طبع)

۱۸- گھر آیا مہمان (زیرِ طبع)